پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

مہینہ غالباً مئی یا جون ۱۹۸۰ء کا تھا کہ اسلام آباد سے وزارت قانون کے سکریٹری کا خط ملا جس میں تحریر تھا "پاکستان گورنمنٹ نے ہجری صدی تقریبات کے سلسلہ میں ایک بین الاقوامی سیمینار "دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں اسلام کا حصہ" کے موضوع پر دسمبر کے ماہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، عنوانات مباحث کی ایک فہرست منسلک ہے، آپ سے درخواست ہے کہ ان عنوانات میں سے کسی دو پر آپ مقالے لکھیں، ستمبر تک یہ مقالے مل جانے چاہئیں" میں نے دعوت منظور کر لی اور (۱) اسلام میں علم کا تصور اور اس کی اہمیت، اور (۲) اسلام اور خواتین کے دو موضوعات پر مقالے لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ انگریزی میں لکھوں گا۔ وعدہ کر تو لیا۔ لیکن خدا کا حکم! ۵/ مئی کو میری اہلیہ پر فالج کا شدید حملہ ہوا، میڈیکل کالج میں داخل کر دی گئیں، دو مہینے تک علاج معالجہ چلتا رہا۔ لیکن جاں بر نہ ہو سکیں اور ۴ جولائی کو خدا کو پیاری ہو گئیں۔ اس حادثہ نے میری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا اور لکھنے پڑھنے کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا، تاہم وعدہ کا ایفا ضروری تھا، جس طرح بن پڑا "علم" پر ایک مقالہ اردو میں لکھ کر تیار کر لیا اور ۴ ستمبر کو میری ایک بچی ہوائی جہاز سے کراچی واپس جا رہی تھی اس کے ہاتھ مقالہ روانہ کر دیا۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد اسلام آباد سے مقالہ کی رسید آئی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ اب کانفرنس دسمبر کے بجائے جنوری ۱۹۸۱ء میں ہو گی، پھر یہ خبر ملی کہ جنوری میں بھی نہ ہو گی، مارچ

میں ہونے کا امکان ہے۔

۲۰ سے لے کر ۲۳ فروری تک حیدرآباد میں جماعت اسلامی کی چھٹی آل انڈیا کانفرنس تھی اور ۲۴ و ۲۵ کو دارالعلوم حیدرآباد کی طرف سے دینی تعلیم اور مدارس کے نظم ونسق پر ایک آل انڈیا سیمینار تھا۔ یہ دونوں اجتماعات نہایت عظیم الشان اور اپنے اداروں کی شہرت وعظمت کے شایان شان تھے۔ میں اُن میں شرکت کا وعدہ کر چکا تھا اور یوں بھی حیدرآباد کی سوسائٹی، یہاں کا کلچر اور تہذیب و ثقافت جو اجڑے ہوئے گلشن میں باد بہاری کی ایک تازہ لہر اور موج نو ہے، مجھے اس درجہ پسند اور مرغوب ہے کہ وہاں جانے کا بہانہ ڈھونڈتا ہوں اور وہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں وقت گزار کر دل و دماغ کی سیر و تفریح کا سامان کر لیتا ہوں، بہرحال ان اجتماعات سے فارغ ہو کر ہوائی جہاز کے ذریعہ (جس کا انتظام دارالعلوم حیدرآباد نے کیا تھا) ۲۷ فروری کو علی گڑھ پہنچا تو ڈاک میں پاکستان گورنمنٹ کا ایک خط بھی ملا کہ: " مجوزہ کانفرنس اسلام آباد میں ۷ سے ۱۰ مارچ تک منعقد ہوگی، آپ اس میں شریک ہوں " اس کے بعد دوسرے دن یعنی ۲۸ فروری کو نئی دہلی سے افضل محمود صاحب منسٹر پاکستان ایمبیسی کا ٹیلیگرام ملا کہ فوراً مطلع کیجیے کہ آپ پاکستان جا رہے ہیں یا نہیں؟ پہلی مارچ کو اتوار تھا۔ اس لیے میں پیر کے دن ۲ مارچ کو صبح کی ٹرین سے نئی دہلی پہنچا۔ پاکستان سفارت خانہ میں افضل محمود صاحب سے ملا، بڑے تپاک اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، علمی اور ادبی ذوق کے آدمی ہیں، کچھ دیر اس کے مطابق گفتگو کرتے رہے، اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ ظفر صاحب کے حوالہ میرا معاملہ کر دیا، ظفر صاحب نے ویزا کے فارم دیے اور کہا کہ اگرچہ کانفرنس ۷ سے شروع ہے، لیکن آپ کو ایک دن پہلے یعنی ۶ کو اسلام آباد پہنچنا ہوگا۔ کیونکہ ۶ کو P.I.A. کی پرواز لاہور کے لیے نہیں ہے، مجھے اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ ظفر صاحب نے اسی وقت جہاز کے آفس کو فون کر کے میری سیٹ ریزرو کرا دی یہاں سے روانہ ہو کر میں سعودی عربیہ کے سفارت خانہ آیا۔

بعض دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کی۔ انھوں نے مکلف چائے سے تواضع کی اور عربی مجلات و رسائل اور چند کتابوں کا پیکٹ میرے ساتھ کر دیا، دفتر برہان پہنچکر مفتی صاحب نے ملا۔ کھانا کھایا، آرام کیا اور شام کی ٹرین سے علی گڈھ واپس آگیا۔

پاکستان کے لیے روانگی ۵ رکی صبح کو علی گڈھ سے روانہ ہوا۔ پاکستانی سفارت خانہ پہنچتے پہنچتے گیارہ بج گئے تھے، جہاز کی اڑان ساڑھے تین بجے سہ پہر میں تھی اور ابھی کام کئی ایک کرنے کے تھے اس لیے طبیعت متوحش تھی کہ دیکھیے کیا ہو الیکن گجرات یونیورسٹی احمد آباد کے شعبۂ اقتصادیات کے استاد ڈاکٹر جعفر لالی بھی ہمارے ڈیلی گیشن کے ایک ممبر تھے، وہ ابھی ہوائی جہاز کے ذریعہ احمد آباد سے نئی دہلی پہنچے اور اس وقت پاکستانی سفارت خانہ میں بیٹھے ویزا فارم کی خانہ پری کر رہے تھے۔ اُن سے میری ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کو اطمینان ہوا۔ میرے کاغذات کی تکمیل ہو چکی تھی، لیکن معیت کے خیال سے میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ جب ڈاکٹر جعفر لالی کے کاغذات کی بھی تکمیل ہو گئی اور انھیں ویزا مل گیا تو اس وقت بارہ بجے تھے اور ابھی ہم کو امیگریشن سرٹیفکٹ بھی لینا تھا۔ اس لیے رواں دواں سفارت خانہ سے باہر آئے، ایک اسکوٹر پکڑا اور شاستری بھون پہنچے یہاں پاسپورٹ آفس میں داخل ہوتے تو مردوں اور عورتوں کا ہجوم بے پناہ دیکھتے ہی اوسان خطا ہو گئے، اس دفتر میں میرے ایک شاگرد افسر ہیں ان کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے، بہر حال ہم دونوں نے امیگریشن سرٹیفکٹ کے فارموں کی خانہ پری کی اور انھیں داخل دفتر کر کے کیو میں کھڑے ہو گئے، ایک بجے ہماری باری آئی۔ اب ہم نے شاستری بھون سے پھر ایک اسکوٹر پکڑا اور ٹکٹ لینے کی غرض سے .P. I. A کے دفتر پہنچے، وہ لوگ ہمارا انتظار کر ہی رہے تھے اور تاخیر ہو جانے سے پریشان تھے، بہر حال انھوں نے ٹکٹ بنانے شروع کیے، میرا سامان دفتر برہان میں تھا اس لیے میں ڈاکٹر لالی کو وہاں چھوڑ کر اسی اسکوٹر میں دفتر آیا اور اپنا سامان لے کر فوراً واپس ہو گیا۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ دو لقمے حلق میں ڈال لوں۔ پی، آئی، اے کے

دفتر پہنچا تو ٹکٹ تیار تھے۔ اب پونے دو بج چکے تھے اور دو بجے ہم کو ایرپورٹ پر رپورٹ کرنی تھی۔ اب دفتر سے سیدھے پالم کو ہی ہم دونوں روانہ ہوئے اور وقت پر پہنچ گئے۔

سب کام جو سفر پاکستان کے لیے ضروری تھے پورے ہو گئے تھے۔ البتہ میرا اپنا ایک اور ضروری کام نہیں ہو سکا اور وہ یہ تھا کہ ۳۰ر مارچ سے ۲ر اپریل تک خرطوم (سوڈان) میں ایک کانفرنس "الدعوۃ الاسلامیۃ" کے موضوع پر ہونے والی تھی۔ مجھ کو اس میں شرکت کی دعوت ملی تھی جو میں نے منظور کر لی تھی، اور کانفرنس کے لیے ان لوگوں کی فرمائش کے مطابق ایک طویل مقالہ انگریزی میں "ہندوستان میں اسلام کا مستقبل" کے موضوع پر لکھ کر خرطوم روانہ کر بھی چکا تھا۔ اب خیال تھا کہ نئی دہلی میں سفارت خانہ سے سوڈان کا ویزا بھی لے لوں گا تاکہ پاکستان سے ہی سیدھا وہاں چلا جاؤں، افسوس ہے وقت کی تنگی کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا اور چونکہ پاکستان میں دن زیادہ لگ گئے اس لیے سوڈان کا سفر ہو ہی نہ سکا، البتہ میرا مقالہ کانفرنس کی کارروائی میں شامل ہو گیا۔

اب ہم دونوں ایرپورٹ میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر جعفر لالی نے جہاز میں بیٹھنے (Embarkation) کی سو روپیہ فیس ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے سو روپیہ کا نوٹ غائب تھا۔ کسی نے نکال لیا یا گر گیا، ڈاکٹر صاحب کا چہرہ فق ہو گیا کہ فیس کہاں سے دیں گے، میرے پاس روپے موجود تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی نذر کیے، ان کی جان میں جان آئی۔ کہنے لگے: یہ روپیہ قرض ہے میں آپ کو پاکستان پہنچ کر ادا کر دوں گا"۔ میں نے کہا: ہرگز نہیں، قرض نہیں بلکہ آپ کی نذر ہے"۔

بہرحال کسٹم وغیرہ سے فراغت کے بعد ہم دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (اعظم گڈھ) ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) سید اوصاف علی (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی) اور ڈاکٹر عبدالمعز منظر وہاں پہلے سے موجود تھے، سب اپنے جانے پہچانے اور بے تکلف دوست تھے، البتہ

منتظر صاحب سے ملاقات پہلی مرتبہ ہوئی، معلوم ہوا کہ پٹنہ کالج بہار میں اقتصادیات کے استاد ہیں اور ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا ان کا یہ پہلا موقع ہے، اس بنا پر کسی قدر گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے، ایسے ہم کو دیکھا تو ان کو سکون ہوا اور ہم نے بھی ان کو جلد بے تکلف بنا لیا۔

۳ ½ اور چار بجے کے درمیان جہاز اڑا اور ۵۴ منٹ میں لاہور پہنچا دیا یہاں اسلام آباد کے لیے جہاز تبدیل کرنا تھا میں نے لاہور ٹیلیگرام دے دیا تھا اور یوں بھی اخبارات میں خبر چھپ گئی تھی کہ انڈین ڈیلی گیشن آج پہنچ رہا ہے اس لیے میاں اسلم (پروفیسر محمد اسلم پنجاب یونیورسٹی لاہور) بچوں کے ساتھ موجود تھے، لیکن چونکہ ایک پاکستانی طیارہ کے اغوا کا واقعہ چند روز پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے جگہ جگہ پہرا تھا، روک ٹوک سخت تھی اور مسافروں کو غیر مسافروں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ میاں اسلم اور بہت سے لوگ، سب گیٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے، اب اسلام آباد جانے والے جہاز میں بیٹھنے کے لیے ہمیں جس لاؤنج میں انتظار کرنا تھا اس کی طرف جانے کے لیے ہم کو اسی گیٹ کے سامنے سے گزرنا پڑا اور بچوں کی نگاہ مجھ پر پڑی تو "نانا، نانا" کہتے ہوئے وہ اور میاں اسلم میری طرف لپکے اور میں بھی انھیں دیکھ کر ٹھٹک کے گیٹ پر آگیا، لیکن گیٹ بند تھا اور اس پر پہرہ دار بھی موجود تھا۔ ردا ردی میں میاں اسلم صرف یہ کہہ سکے کہ ہمارا خیال تو یہ تھا کہ آپ کانفرنس سے ایک دن پہلے آرہے ہیں تو آج لاہور میں قیام کریں گے اور کل شام میں اور آپ دونوں اسلام آباد چلیں گے، اسی خیال کی وجہ سے ریحانہ یہاں نہیں آئی ہیں اور گھر پر آپ کے لیے چائے لیے بیٹھی ہوں گی" میں نے کہا: ہم لوگ یہاں ٹرانزٹ پر ہیں، کہیں آنے جانے کا سوال ہی نہیں! بس اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ گیٹ کے پہرہ دار نے خوش اخلاقی سے کہا: "چلیے، تشریف لے چلیے" میں سمجھ گیا کہ بات کرنا بھی ممنوع نہیں تو ناپسندیدہ ضرور ہے، اس لیے میں آگے بڑھ گیا۔

اسلام آباد میں: لاہور میں ہم نے عصر کی اور اس کے بعد مغرب کی بھی نماز پڑھی، ۷ ½ بجے جہاز اڑا اور آٹھ بجے راولپنڈی ایرپورٹ پر پہنچ گیا، یہاں کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے دو

حضرات موجود تھے، ایرپورٹ کی رسمی کارروائی کے بعد تین بڑی کاروں میں ہم لوگ روانہ ہوئے اور اسلام آباد ہوٹل میں مقیم ہوئے، میرے کمرہ کا نمبر ۵۶ تھا منظر صاحب میرے پڑوس میں تھے اور باقی سب احباب اوپر کی منزلوں میں کوئی کہیں اور کوئی کہیں تھا۔ یہ ہوٹل پنج کوکبی (یعنی Five Star) ہے اس لیے یہ بتانا فضول ہے کہ کمرے کیسے اور کتنے آراستہ و پیراستہ تھے!

احباب کی آمد | ابھی میں استقبالہ (Reception) میں کھڑا کمرہ پر قبضہ کرنے کی رسمی کارروائی کر ہی رہا تھا کہ محب قدیم و صمیم پروفیسر عبدالواحد ہالی پوتہ، ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ڈاکٹر منیر احمد مغل (جج) مولانا طاہر السورتی، مسٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی تشریف لے آئے۔ ایک مدت کے بعد ان احباب سے ملاقات کر کے اور یہ محسوس کر کے ہم لوگوں کے ہوٹل پہنچتے ہی یہ احباب ازراہ کرم و اخلاص تشریف لے آئے قلبی اور روحانی مسرت ہوئی، لیکن میں ان حضرات سے پندرہ منٹ کی اجازت لے کر اپنے کمرہ میں گیا، سامان ایک جگہ رکھوایا، منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور اب چونکہ ڈنر کا وقت بھی ہو گیا تھا اور دوپہر کا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اشتہا بھی شدید تھی اس لیے میں احباب کو لے کر ڈائننگ ہال میں آیا اور کھانے کا آرڈر دیا۔ اس وقت ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بھی اپنے کمرہ سے آگئے اور شریک طعام ہوئے، کھانے کے درمیان گفتگو ہوتی رہی، اس وقت جو احباب جمع تھے ان میں صرف ایک ڈاکٹر منیر احمد مغل ایسے تھے جن سے میں پہلے سے واقف نہیں تھا۔ پروفیسر ہالی پوتہ انھیں ساتھ لائے تھے، انھوں نے موصوف کے تعارف میں فرمایا "یہ جج ہیں لیکن بہترین علمی صلاحیتوں کے مالک ہیں، انھوں نے پروفیسر ہالی پوتہ کی زیر نگرانی مولانا عبیداللہ سندھی پر انگریزی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب آج کل مولانا کی تفسیر کو اپنی تحقیق اور حواشی کے ساتھ بڑی محنت سے اڈٹ کر رہے اور اس کا انگریزی اور اردو ایڈیشن مع ایک طویل مقدمہ کے مرتب کر رہے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی پر میری کتاب اور سندھ میں اس کی مقبولیت

اس موقع پر یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کو خاص سندھ میں عظمت و تقدس کا جو مقام رفیع حاصل ہے وہ عہد حاضر کی کسی شخصیت کو حاصل نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا اس کے مستحق تھے بھی، مولانا کے ساتھ اس تعلق کا ہی نتیجہ ہے کہ سندھ کے علماء اور دیگر ارباب علم و ادب میری کتاب[1] "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد" کو بہت عزیز رکھتے اور اس کی وجہ سے کتاب کے مصنف سے محبت کرتے ہیں؛ چنانچہ پروفیسر بالی پوتہ کو خاکسار راقم الحروف کے ساتھ جو قلبی تعلق اور محبت ہے اس میں بڑا دخل اُن کے سندھی ہونے کو بھی ہے، اور اس محبت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ میں نے ہوٹل میں قدم رکھا ہی تھا کہ ڈاکٹر مغل کے ساتھ تشریف لے آئے اور دیر تک قیام فرما رہے۔

---

[1] اس کتاب کی تالیف کو چھتیس برس گذر گئے، نئی نسل کو اس کے سبب تالیف کا کیا علم ہوگا۔ اس لیے مختصراً عرض یہ ہے کہ میں نے برہان میں ہزاروں صفحات لکھے ہیں، لیکن میرے دو مضمون ایسے چھپے ہیں جنھوں نے برصغیر کے علمی اور دینی حلقوں میں دھوم مچادی اور سخت ہیجان و بحران کی کیفیت پیدا کردی: (۱) مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد" اور (۲) جامع المجددین مرتبہ مولانا عبد الباری ندوی پر تبصرہ" اول الذکر مقالہ لکھنے کی تقریب یہ ہوئی کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے انتقال کے بعد معارف اعظم گڑھ میں مولوی مسعود عالم ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں مضمون نگار نے مولانا پر الحاد و زندقہ کا الزام لگایا تھا۔ میں نے یہ مضمون پڑھا تو سخت طیش کے عالم میں اسی وقت اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا جو سات قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مقالہ نے ملک میں دھوم مچادی اور دفتر برہان میں خطوں کا انبار لگ گیا، انھیں دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک دن ایک پارٹی میں میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے "وہ مارا" "وہ مارا" کہتے ہوئے پیچھے سے میرے دھپ مارا۔ میں نے مڑکر دیکھا تو بابائے اردو مولوی عبد الحق تھے۔ (باقی صفحہ ۳۵۷ پر)

یہ تو تھے پروفیسر بالی پوتہ اور ڈاکٹر مغل، ان کے علاوہ باقی تینوں حضرات ادارۂ تحقیقات اسلامی جو پاکستان گورنمنٹ کا بڑا نامور اور مشہور ادارہ ہے اُس سے متعلق ہیں، مولانا السورتی جو عربی زبان و ادب کے نامور محقق اور ادیب مولانا محمد السورتی کے فرزند ارجمند اور علم و فضل میں الولدُ سِرٌّ لابیہ کے مصداق ہیں اس ادارہ میں ریڈر اور غازی اور اصلاحی صاحبان اس میں فیلو

(بقیہ حاشیہ ص۷۴۷) میں کھڑا ہوگیا اور پوچھا: مولانا! آپ کیا فرما رہے ہیں! کس نے مارا اور کس کو مارا؟ میں سمجھ نہیں سکا"، مولانا کڑک کر بولے: ارے میاں! وہی تمہارا مضمون جو برہان میں نکل رہا ہے، میں نے عرض کیا: "حضرت! آپ یہ کیا فرماتے ہیں، مجھے تو اطلاعات مل رہی ہیں کہ اس مضمون کا جواب دارالمصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دفتر ترجمان القرآن، پٹھان کوٹ اور جامعۂ دارالسلام، عمر آباد میں لکھا جارہا ہے اور مضمون کے ختم ہوتے ہی چاروں طرف سے مجھ پر یورش ہوگی" مولانا نے بڑے زور سے کہا: غلط اور بالکل غلط، تمہارا مضمون لاجواب ہے، میں یقین دلاتا ہوں کہ ایک شخص بھی اس کے جواب میں نہیں لکھ سکے گا"، ہوا تو واقعی یہی کہ کہیں سے کوئی تحریر جواب میں شائع نہیں ہوئی، لیکن علماء میں بحران بہت زیادہ پیدا ہوا، یہاں تک کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، مولانا صبغۃ اللہ بختیاری، مدراس اور چند علماء نے اس مضمون کے خلاف سخت احتجاجی خطوط مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو لکھے، اور ان خطوط سے متاثر ہوکر ایک مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ناراضگی کے لہجہ میں فرمایا بھی کہ "بھئی! تم غریب مسعود عالم کا قصور کبھی معاف کرو گے بھی یا نہیں، بہت لکھ چکے، اب ختم کرو" میں نے جواب دیا: میں ہرگز ختم نہیں کروں گا۔ جب تک چور کو اس کے گھر نہیں پہنچا دوں گا دم نہ لوں گا، ہاں البتہ میری تحریر میں کوئی بات غلط اور بغیر حوالہ کے ہے تو اس کی نشان دہی ضرور کیجیے۔ میں اس پر غور کروں گا اور پھر میری بات غلط ثابت ہوئی تو میں اس سے رجوع کرلوں گا" مولانا نے یہ سنا اور مسکرانے لگے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ہیں ان تینوں حضرات سے میرا تعلق پہلے سے ہے، کھانے سے فراغت کے بعد ہم سب چہل قدمی کی غرض سے ہوٹل سے باہر چلے گئے، ایک دکان پر مولانا السورتی نے پانوں سے تواضع کی، اس سے فراغت کے بعد ہم ہوٹل واپس آئے تو میں نے احباب سے اجازت لی اور کمرہ میں آکر عشا کی نماز پڑھی، حسب معمول مطالعہ کیا اور سو گیا، پورا دن دوڑ دھوپ میں گذرا تھا اس لیے نیند بہت اچھی آئی اور روز گذشتہ کی سب تھکن دور ہو گئی۔

دوسرے دن ناشتہ سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا تو استقبالیہ (Reception) کے سامنے پروفیسر منظور احمد، صدر شعبۂ فلسفہ کراچی یونیورسٹی اور پروفیسر خورشید احمد (ماہر اقتصادیات) مل گئے۔ دونوں سے دیرینہ تعلق ہے، بڑے تپاک سے ملے، خیریت طلبی اور مزاج پرسی کے بعد پروفیسر منظور احمد، جو کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی کے بڑے فعال اور ممتاز ممبر بھی ہیں، فرمایا: کل کانفرنس شروع ہو رہی ہے، اس کی ایک کمیٹی کے دوسرے جلسہ کی صدارت آپ کو کرنی ہے، ہم نے بامید منظوری پروگرام میں آپ کا نام درج کر دیا ہے، امید ہے آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔" میں نے پروگرام کمیٹی کا شکریہ ادا کیا اور کہا: مجھے تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے، "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"۔ اس کے بعد میں نے پروفیسر خورشید احمد سے کہا: آپ اور ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری (سعودی عربیہ) دونوں نے مل کر کتاب "نذر سید ابو الاعلیٰ مودودی (Islamic Perspiction)" جو اسلامک فاؤنڈیشن، لندن کی طرف سے شائع ہوئی ہے اڈٹ کی ہے، میں نے اس کتاب پر "اسلامک کلچر" حیدرآباد" کے لیے ریویو لکھا ہے جو اپریل ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں طبع ہوگا۔ مگر اسلامک کلچر والے ستم یہ کرتے ہیں کہ کتاب تبصرہ نگار کے پاس نہیں چھوڑتے، واپس منگوا لیتے ہیں، چنانچہ میں نے کتاب واپس کر دی۔ اب آپ ہی از راہ کرم کتاب کا ایک نسخہ میری لائبریری کے لیے دے دیجیے۔"
پروفیسر خورشید صاحب نے کہا: ضرور، ابھی لیجیے اور تھوڑی دیر کے بعد کتاب اپنے دستخط کے ساتھ میرے کمرہ میں پہنچا دی، ابھی میں ان حضرات سے گفتگو کر ہی رہا تھا کہ جناب اے۔ کے بروہی

وزیر قانون جو کانفرنس کی تنظیمی کمیٹی کے چیرمین بھی ہیں تشریف لے آئے، نہایت شائستہ اور اعلیٰ ذوق علمی و ادبی کے انسان ہیں، ان سے ملاقات کر کے ہمیشہ طبیعت مسرور ہوتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد مولانا السورتی اور اصلاحی صاحب آ گئے، ان کے ساتھ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور میں ایک کار میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو گئے۔ جمعہ کے دن یہاں ایک بازار لگتا ہے جو جمعہ بازار کہلاتا ہے، اس کو عرب کے سوق عکاظ کا ایک نمونہ کہنا چاہیے کیونکہ اس بازار میں بداوت کا رنگ غالب ہوتا ہے، ہر قسم کی چیزیں بافراط اور نسبتہً سستی ملتی ہیں، مرد اور خواتین سب، باستثنائے چند سادہ شلوار اور قمیص میں ملبوس مگر نہایت تندرست اور تنومند، سرخ و سپید اور چست! اس منظر کو دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر بعض عمارتیں دیکھیں، ہوٹل واپس آ کر قریب ہی وسیع اور کشادہ مرکزی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اب چونکہ کل سے کانفرنس شروع ہے اس لیے مندوبین کی آمد شروع ہو گئی ہے اور ہوٹل میں بڑی گھما گھمی اور چہل پہل ہے آنے والوں میں میرے لیے بہت سے چہرے نئے ہیں لیکن چند احباب وہ بھی ہیں جن سے دیرینہ تعارف ہے۔

یہاں معلوم ہوا کہ ہندوستان سے آنے والوں میں ہم چھ افراد کے علاوہ چند اور اصحاب بھی تھے جو پشاور کے ایک سیمینار میں بھی مدعو تھے اور اس سے فارغ ہو کر اب اسلام آباد پہنچے تھے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں: (۱) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ، ناگپور، (۲) ڈاکٹر ایس۔ ایم انصاری، شعبۂ طبیعیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۳) ڈاکٹر اوصاف احمد شعبۂ اقتصادیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور ہاں! ہمارے دیرینہ دوست ڈاکٹر برکات احمد بھی پہلے سے وہاں موجود تھے، وہ بھی شریک ہوئے، اس طرح ہندوستان کے مندوبین کی تعداد عشرۃ کاملۃ ہو جاتی ہے، ہندوستان سے پانچ چھ اور حضرات مدعو تھے جن کے نام مندوبین کی فہرست میں درج تھے لیکن وہ شریک نہیں ہو سکے، پاکستان کو شامل کر کے کل ۳۲ ملکوں کے نمائندے شریک کانفرنس ہوئے جن میں ایک سو پندرہ نمائندے پاکستان کے تھے اور ۸۸ ممالک غیر کے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ممالک غیر کے مندوبین میں سب سے بڑی تعداد انڈیا کے مندوبین کی تھی،

اور عالم اسلامی بین الاقوامی کانفرنسوں کے خلاف خواتین کی تعداد بھی کافی تھی، قیام کا انتظام دو جگہ تھا، ممالک غیر کے مندوبین اسلام آباد ہوٹل میں اور پاکستان کے مندوبین راولپنڈی کے انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے، میاں اسلم جو پاکستان کے مندوب آج شام کو ہی لاہور سے آگئے تھے، مگر مؤخر الذکر ہوٹل میں مقیم تھے۔ میں اپنے ہوٹل میں ان کا منتظر رہا۔ صبح جب ملاقات ہوئی تو حقیقت حال کا علم ہوا، آج شام کو مغرب کے بعد پروفیسر ہالی پوتہ پھر آئے مگر اس وقت ان کے ساتھ بیگم بھی تھیں جو سندھ کے ایک زنانہ کالج میں اسلامیات کی پروفیسر ہیں اور کانفرنس میں مندوب بھی ہیں، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر میر احمد مغل آگئے، مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر قرآن کا انھوں نے جو انگریزی ترجمہ اپنی شرح اور حواشی کے ساتھ کیا ہے، اس کی دو بھاری بھاری ضخیم جلدیں اپنے ساتھ لیتے آئے تھے، پروفیسر ہالی پوتہ اور ڈاکٹر مغل دونوں کا اصرار تھا کہ میں ان جلدوں کو پڑھ لوں اور ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دوں، یہ حضرات اگر اصرار نہ کرتے تب بھی دل کا تقاضا تھا کہ میں انھیں از اول تا آخر غور اور توجہ سے پڑھوں لیکن کانفرنسوں کا عالم یہ ہوتا ہے کہ "فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی" کیونکہ مقالات کی روزانہ تین چار نشستوں کے علاوہ، لنچ، ڈنر اور عصرانہ اور دوسرے ضمنی پروگراموں کی مصروفتیں بھی تو ہوتی ہیں جو کسی اور کام کا نہیں رکھتیں، تاہم کتاب اہم اور میری خاص دلچسپی کی تھی اس لیے جس طرح بن پڑا کتاب کا فاضلانہ مقدمہ اور شروع کے سو صفحات تو مسلسل پڑھے اور اس کے بعد کتاب کو الٹ پلٹ کر اِدھر اُدھر سے دیکھا اور اس سے بڑی مسرت ہوئی۔

مسرت کی اصل وجہ دو تھیں: (۱) ایک یہ کہ باہمہ علم و فضل و کمال و دقت نظر مولانا عبیداللہ سندھی میں ایک نقص یہ تھا کہ وہ تقریر و تحریر پر قدرت تامہ نہیں رکھتے تھے اور اس بنا پر تقریر میں زیادہ اور تحریر میں ان کی زبان اور قلم سے بعض اوقات ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جو ان کی نسبت غلط فہمی کا باعث ہو سکتی تھیں اور ارباب غرض ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، خود مولانا کو اس کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ جب وہ دہلی میں مقیم تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رہتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا:

افسوس ہے کہ میں اپنے مافی الضمیر کو کما حقہ، ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں اس لیے لوگ اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق میری باتیں کچھ سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے اور پھر انھیں اپنے طریقہ پر بیان کرتے ہیں جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں' اس کے بعد ارشاد ہوا: بس ایک ہی حل میری سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم سبقاً سبقاً حجۃ اللہ البالغہ" مجھ سے پڑھ لو اور ہر سبق کی تقریر کو قلمبند کر کے دوسرے دن مجھے دکھا دو' مجھ کو تمہاری فہم اور قلم دونوں پر اعتماد ہے' یہ کام مکمل ہو جائے گا تو میں بڑی خوشی سے اعلان کر سکوں گا کہ میرے افکار و نظریات کے بارہ میں صرف اس کتاب پر اعتماد کیا جائے" میری خوش قسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود مولانا مجھ کو درس حجۃ اللہ البالغہ کی خواہش کریں اور ساتھ ہی اپنی ترجمانی کا شرف بھی عطا فرمائیں۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی، مگر مشکل یہ تھی کہ مولانا جامعہ میں رہتے تھے اور میں قیدی پورہ (قرول باغ) میں' اور دونوں میں ۸ یا ۹ میل کی مسافت حائل تھی' مولانا نے تجویز کی کہ مسجد فتح پوری میں ایک کمرہ کا انتظام کر لیا جائے ہفتہ میں تین مرتبہ مولانا جامعہ سے وہاں پہنچیں گے اور میں شیدی پورہ سے مغرب سے عشا تک درس ہوگا اور اس کے بعد مولانا شب یہیں بسر کریں گے' میں نے ہر چند عرض کیا: حضرت! آپ زحمت نہ کریں' میں خود جامعہ حاضر ہو جایا کروں گا، مگر مولانا نہ مانے' فرمایا*: اگر تمہیں کبھی بس نہ ملی تو اہل خانہ پریشان ہوں گے، اللہ اکبر! عالم* اسلام کے اس ضعیف العمر مرد مجاہد کا ولولۂ فیض رسانی اور اس کے لیے عزم جفاکشی! بہرحال یہ طے ہو گیا کہ درس مسجد فتحپوری کے ایک کمرہ میں ہوگا، لیکن یہ پروگرام شروع ہونے والا تھا کہ صاحبزادی کی علالت کی خبر آئی اور مولانا لاہور چلے گئے' اور پھر دہلی نہ آسکے' کچھ دنوں کے بعد انتقال ہو گیا' اور " ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال " یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی، تو اب ڈاکٹر مغل کی کتاب دیکھ کر بڑی خوشی اس سے ہوئی کہ مولانا جو کام مجھ سے لینا چاہتے تھے وہ ڈاکٹر مغل کے ذریعہ بحسن و خوبی ایک بڑی حد تک انجام پذیر ہو گیا۔

(۲) اور دوسری خوشی کتاب کے اس مسودہ کو دیکھ کر اس بات سے ہوئی کہ بعض حلقوں میں

مولانا کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ دور ہو جائیں گی، مثلاً مولانا کی نسبت ایک عام خیال ہے کہ وہ کیمونسٹ تھے۔ اس کتاب سے اس کی خاطر خواہ تردید ہوتی ہے، کیونکہ مولانا نے تفسیر میں کیمونزم پر سخت تنقید کی ہے اور اسے شرک کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

اب کل سے کانفرنس شروع ہے، آج شب میں ہم لوگوں کو کانفرنس کے سلسلہ کا لٹریچر مقالات کی آٹھ جلدیں، جن میں سے دو اردو کے مقالات کی ہیں اور باقی چھ انگریزی مقالات، اور ایک اعلیٰ قسم کا اٹیچی کیس وغیرہ یہ سب چیزیں مندوبین کے کمروں پر پہنچا دی گئیں۔ ابھی چند روز پہلے ہائی جیکنگ کا واقعہ پیش آچکا تھا اس لیے خصوصاً سکورٹی انتظامات بہت وسیع اور سخت ہیں۔ ہوٹل اور اس کے ارد گرد جگہ جگہ پولیس تعینات ہے اور خفیہ پولیس کے لوگ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، ہوٹل میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ مندوبین کو یہ ہدایت ہے کہ ہوٹل سے باہر زیادہ دور تک پیدل نہ جائیں، ہر مندوب کے لیے ضروری ہے کہ اپنے رنگین فوٹو کے ساتھ (جس کا انتظام ہوٹل میں موجود ہے) بیج ہر وقت لگائے رکھے ورنہ اس کے بغیر وہ کانفرنس ہال میں داخل نہ ہو سکے گا۔ (باقی آئندہ)

اردو عربی ڈکشنری

مؤلف مصباح اللغات

جناب ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی کی دوسری کاوش۔ اردو داں طلبہ و اساتذہ کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی۔ موصوف نے یہ کتاب تالیف کر کے یہ ضرورت پوری کردی۔ تقطیع خورد ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت مجلد -/۱۰ روپے۔

ملنے کا پتہ:-

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶